محمدالیاس ندوی رامپوری
ilyasrampuri@rediffmail.com
Cell No. 09990002673

صحافت کی اہمیت

انسانی معاشرے میں صحافت کے کردار اور اہمیت وضرورت کی جب بات آتی ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اکبر الہ آبادی کا درج ذیل شعر دہرایا جاتا ہے:

کھینچوں نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

جو لوگ ترقی یافتہ ممالک کے عالم انسانی پر غلبہ واستحکام کی بات کرتے وقت ان کی دفاعی قوت اور بطور خاص ایٹمی قوت پر نظر رکھتے ہیں وہ شاید اس شعر کو اتنی اہمیت نہ دیں تاہم جو لوگ ان کی پروپیگنڈہ کی نفسیات، سیاست اور ہتھکنڈوں سے واقف ہیں اور انہوں نے خاص اس موضوع پر لکھی گئیں بعض مغربی مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے وہ ضرور اس شعر کو پراز معنی بتائیں گے۔اور جو اتنا جانتے ہیں وہ یقینی طور سے یہ بھی جانتے ہیں کہ گلوبل ولیج کے نام سے مشہور ہماری معاصر دنیا میں پروپیگنڈے کو فتح وشکست کی فیصلہ کن جنگ میں ایک اساسی اور بنیادی قوت کی اہمیت حاصل ہے اور جو اتنا جانتے ہیں وہ اس بات سے بھی انکار نہیں کرسکتے کہ پروپیگنڈے کی سواری صرف اور صرف میڈیا ہے۔پروپیگنڈے کے پلان اور منصوبوں میں جس چیز کے توسط سے رنگ آمیزی کی جاتی ہے وہ یہی ہے۔

جب ہم معاشرے میں صحافت کے کردار اور اہمیت وضرورت پر روشنی ڈال رہے ہوں گے تو ہمیں لامحالہ ہندوستان میں اردو صحافت کے حوالے سے جدوجہدِ آزادی میں اس کے کردار کا جائزہ لینا ہوگا۔ملک کی آزادی کی جدوجہد میں اردو زبان وادب کا اور بطور خاص

اردو صحافت کا جو رول رہا ہے وہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں نظریں تو چرائی جاسکتی ہیں، پہلو بھی بچایا جاسکتا ہے تاہم اس صداقت سے بالکلیہ انکار نہیں کیا جاسکتا۔

قلم سے ٹپکنے والی روشنائی اور شہید کے بدن سے ٹپکنے والا لہو، ان دونوں میں یہ خصوصیت ہے کہ جب ان میں سے کوئی بھی ٹپکتا ہے جو جم جاتا ہے:

خون پھر خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا

کم وبیش ڈیڑھ سو سال کے طویل عرصے پر پھیلی ہوئی جدوجہد آزادی ہندوستان کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور اس میں اردو کا کردار نا قابل فراموش ہے۔ اردو صحافت کے بے باک اور نڈر، علم وعمل کے شیدائی اور فکروفن کے سرتاج صحافیوں نے اپنے قلم کو بیرونی طاقت کے خلاف جیسے وقف کر رکھا تھا۔ ان کے نزدیک صحافت کوئی پیشہ یا محض تفریح طبع بہم پہونچانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، انہوں نے صحافت کو فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ ضرور برتا مگر وہ اسی میں الجھ کر نہ رہ گئے۔ وہ فن اور لوازمات فن سے آگے اور بہت آگے تک چلے گئے، انہوں نے اس سے وہی کام لیا جو کسی زمانے میں شمشیر وسناں اور تیر وتفنگ سے لیا جاتا تھا۔ انہوں نے ایک طرف ہندوستانی عوام کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ کی تو دوسری طرف اس کے جذبۂ ایمان کو گرمانے، اس کے تن من میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنے اور آپس میں اتحاد واتفاق اور باہم بھائی چارے کو فروغ دینے کی پوری کوشش کی۔ ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ اردو صحافت ہی کی دین ہے۔ اردو اخبارات ہی نے ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کی روح پھونکی اور ان کو انقلاب کے لیے آمادہ کیا۔ اٹھارہ سو ستاون کی بغاوت جو ملک کی آزادی کی خاطر پہلا منظّم اقدام تھا اس کے پس پردہ فوج میں کارتوسوں کی تقسیم کے جس منحوس واقعہ کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے، اس کو پر لگا کر ہوا کے دوش پر اڑا کر پورے ملک میں پھیلانے اور عوام کے ضمیر کو جھنجھوڑنے اور ان کے دلوں میں بغاوت کی روح پھونکنے کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ صرف اردو اخبارات ہی کا حصہ ہے۔

عتیق صدیقی نے اپنی کتاب ''ہندوستانی اخبار نویسی'' میں فرانسیسی مؤرخ گارساں دتاسی

کا جو بیان نقل کیا ہے اس کی روشنی میں یہ بات سمجھنا آسان ہوگا کہ اردو اخباروں نے آزادیٔ ہند میں کیا کردار ادا کیا اور کس طرح سے اپنا فرض نبھایا۔ بطورِ خاص اٹھارہ سو ستاون کے اس یادگار واقعہ کے تعلق سے کیا کارنامہ انجام دیا۔ گارساں دتاسی کا بیان ہے:

''ان منحوس کارتوسوں کی تقسیم کے موقع پر ہندستانی اخباروں نے، جو بد دلی پھیلانے میں پہلے ہی سے مستعدی دکھا رہے تھے، اپنی غیر محدود آزادی سے فائدہ اٹھایا اور اہل ہند کو کارتوسوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کرنے پر آمادہ کیا، اور یہ باور کرا دیا کہ اس حیلے سے انگریز ہندستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں'' [محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، صفحہ ۳۵۹]

انگریز حکومت اس بات کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھی اور اردو اخبارات کو اپنے لیے فال بد تصور کرتی تھی۔ وہ معاشرے میں ان کے اثر و نفوذ اور عمل و کردار کو لے کر ہمیشہ مضطرب رہا کرتی تھی۔ اس لیے اس نے ان اخبارات کے خلاف کئی طرح کے اقدامات کیے، نئے نئے قانون بنا کر ان کو پابند سلاسل کرنے کی کوشش کی، اردو ایڈیٹروں کو ہر طرح سے ڈرایا دھمکایا اور قید و بند کی سزائیں دیں، یہاں تک کہ مولوی محمد باقر کو اسی جرم کی پاداش میں تختۂ دار پر بھی لٹکا دیا۔

ہر طرح کی دارو گیر کے باوجود اردو صحافیوں کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ ہوئی، وہ بلاخوف و تردد تختۂ دار پر چڑھ گئے، سلاخوں کے پیچھے جانے کو تیار ہو گئے مگر اپنے مشن سے سر مو انحراف انہیں گوارہ نہ ہوا۔ وہ دیوار زنداں سے سر ٹکراتے رہے اور علم و ادب کی آب یاری کرتے ہے:

ہے مشق سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

انور علی دہلوی اپنی کتاب 'اردو صحافت' جو اردو صحافت سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے، میں جدوجہد آزادی میں اردو صحافت کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا اس نے زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں اس کی تاریخ بہت ہنگامہ خیز رہی ہے۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک ملک گیر پیمانے پر

آزادی اور قومی اتحاد کے لیے جدوجہد کا سہرا اردو صحافت ہی کے سر ہے۔اردو کے اخبارات ہی نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اس ہی کا صحافی اور مدیر مولوی محمد باقر جنگِ آزادی میں شہید ہوا۔اردو اخبارات ہی کے مالکان اور مدیران سب سے زیادہ سامراج کے ظلم وستم کا نشانہ بنے۔قید وبند کی صعوبتیں سہیں۔پریس اور ضمانتیں ضبط ہوئیں لیکن اس سب کے باوجود وہ سنگین سے سنگین حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے،اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت ہندی کے اخبار برائے نام شائع ہوتے تھے انگریزی کے اکثر اخبار انگریزوں کے حامی اور ہم نوا تھے دوسری زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات تنے با اثر نہیں تھے لہذا اردو اخبارات اور اردو صحافیوں ہی نے برطانوی سامراج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔انہوں نے سیاسی بیداری اور تحریک آزادی کے ہراول دستے کا کام کیا۔[از...مقدمہ''اردو صحافت''مرتبہ:انور علی دہلوی،صفحہ۲]

دہلی اردو اخبار سے لے کر آزاد ہند تک سینکڑوں اردو اخبار ہیں جنہوں نے ملک وقوم کی آزادی کی خاطر تن من دھن کی بازی لگا دی اور سر بکف میدان جہاد وعمل میں نکل کھڑے ہوئے اور اس وقت تک اپنے مشن میں جٹے رہے جب تک ان کے دم میں دم رہا یا آزادی کا سپیدۂ صبح نمودار نہیں ہو گیا۔

گربچن چندن نے اپنے ایک مضمون میں جو''تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ'' کے عنوان سے ان کی کتاب ''اردو صحافت کا سفر''میں شامل ہے،اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور بڑی باریک بینی اور ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔وہ اپنے اس مضمون میں اردو صحافت کے ابتدائی دور کی دارو گیر کا ہلکا سا نقشہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''جب انگریز دہلی پر قابض ہو گیا تو 'دہلی اردو اخبار' کے اڈیٹر مولوی محمد باقر کو گولی ماردی گئی۔ یہ ہندوستان کی آزادی کی قربان گاہ پر مطبوعہ دیسی صحافت کی اولین شہادت تھی۔'صادق الاخبار' کے اڈیٹر جمیل الدین ہجر کو بغاوت کے ایک مقدمے میں ماخوذ کیا گیا اور اسے تین سال قید کی سزا ہوئی۔مولانا محمد حسین آزاد کے خلاف بھی وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے لیکن وہ

دہلی سے روپوش ہو گئے۔ صوبہ سرحد کے اخبار 'مرتضائی' کے مدیر کو باغیانہ مضامین لکھنے پر پشاور میں قید کر دیا گیا۔ پورے پریس کا گلا گھونٹ دینے کے اقدام کئے گئے۔" [گربچن چندن، اردو صحافت کا سفر، صفحہ ۱۳۰]

اردو صحافت کا نعرہ "انقلاب زندہ باد" تھا اور اس کا پیغام و مشن اور اس کی آرزو و تمنا یہ تھی:

شہیدِ قوم ہو جانا ہی عمرِ جاودانی ہے
جو وقفِ ملک ہو بس وہ مبارک زندگانی ہے

اردو کے ترقی پسند شعراء کے سرخیل فیض احمد فیض نے ایک بڑی انقلابی نظم کہی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ دل و دماغ میں جسے اترتا چلا جاتا ہے اور جسم و جان میں جوش و ولولہ کی ہزاروں جوت جگا دیتا ہے:

بول؛ کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول؛ کہ زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول؛ کہ جاں اب تک تیری ہے
بول؛ یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و جاں کی موت سے پہلے
بول؛ کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول؛ جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

فیض احمد فیض کے یہ بول، چاہے انہوں نے جس کے لیے بھی تخلیق کئے ہوں سب سے زیادہ جس برادری پر صادق آتے ہیں اور جسے ان کے اولین اور اصلی مخاطبین ہونے کا استحقاق حاصل ہونا چاہئے میرے خیال میں وہ صحافتی برادری ہے۔

ہر فرد اور ہر طبقے کے ساتھ مصلحتیں جڑی ہوتی ہیں، ایک عام آدمی سے لے کر وقت کے حاکم تک جو درجہ بدرجہ عربوں افراد اور ہزاروں، لاکھوں برادریاں پائی جاتی ہیں ان میں سے

ہر کوئی زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر خود کو مجبور پاتا ہے۔اور کئی بار شکوہ کناں ہوتا ہے:

یہ کیسا قانونِ زباں بندی ہے تیری محفل میں

یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

ان کی مجبوریوں کے درازتر سلسلے میں ایک مجبوری وہ بھی ہے جو حقیقت اظہار سے متعلق ہوتی ہے اور حق گوئی و بے باکی سے براہ راست منسلک کی جاسکتی ہے۔یہ مجبوری کوئی ایسی ویسی مجبوری نہیں بلکہ مجبوریوں کی فہرست میں سرفہرست رکھے جانے کی ہر لحاظ سے حقدار و روادار ہے۔تاہم اس آبادگیتی میں ایک شخص اور ایک برادری ایسی ضرور ہے جو کسی بھی طرح کے "قانونِ زباں بندی" کی پابندی اٹھانے کی روادار اور متحمل نہیں ہوسکتی۔وہ انسان کی اس عمومی مجبوری کے سامنے سرنگوں ہونے کے لئے کبھی خود کو تیار نہیں پاتی اور وہ وہی ہے جسے ہم نے چند سطور قبل 'صحافتی برادری' کہا ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے آغاز پر گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے ایک صحافتی قانون نافذ کیا،اسے "قانونِ زباں بندی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے،اس قانون کے مطابق ہر چھاپہ خانے کے لیے لائسنس لینا ضروری قرار دیا گیا اور حکومت کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ جس اخبار کو چاہے بند کردے اور جس اخبار پر چاہے سنسر شپ کی پابندی لگادے ۔اگر صحافت آج بھی زندہ ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ فعال بھی ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کا کوئی بھی قانون صحافت کو پابند سلاسل نہیں کرسکتا۔

اگر صحافی کے لب سی دئے گئے یا اس کے منہ میں ایک گھونٹ پانی یا سیال سونا دیکر اس کو نگلنے اور اگلنے کی پابندی لگادی گئی تو دنیا بہت جلد دیکھ لے گی کہ انسانی آبادی میں پوری طرح جنگل راج نافذ ہوچکا ہے۔

دنیا خاموش رہ سکتی ہے،غلاموں کے لب سۓ جاسکتے ہیں.

حاکم وقت مصلحتوں اور مجبوریوں کا لبادہ اوڑھ سکتے ہیں مگر صحافی خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔اس کا کام ہے بولنا اور کھل کر بولنا۔

محمد شاہد حسین لکھتے ہیں:

''سچ بولنا جہاں صحافی کا مذہب ہونا چاہئے وہیں سچ بولنے کی چھوٹ سرکار کی طرف سے بھی ہونی چاہئے۔اسی چھوٹ کا نام پریس کی آزادی ہے جو دنیا کے بڑے بڑے ملکوں میں کڑی جدوجہد کے بعد حاصل ہوئی ہے۔شروع شروع میں ان ملکوں کے حکمرانوں نے اس پر زبردست پابندیاں عائد کررکھی تھیں۔انہوں نے صحافت کے ابتدائی دور میں وہ باتیں ہرگز نہیں چھپنے دیں جن سے ان کے عمل وارادے کی نقاب کشائی ہو۔شاید وہ بائبل کے اس قول کی صداقت سے واقف تھے کہ''سچ تمہیں آزاد اور نڈر رہنائے گا'' [ماہنامہ ''آجکل'' دہلی، اکتوبر ۲۰۰۳ء]

ہم اپنے اس باب کو گربچن چندن کے اسی مضمون کے آخری پیراگراف پر ختم کرتے ہیں جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''غلامی کا اندھیرا چھٹ گیا اور آزادی کا سورج طلوع ہوگیا۔اس طلوع کے لیے اردو صحافت نے جو جاں فشانی، جگرسوزی اور قربانی کی راہ اپنائی، وہ تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔اس کے کالموں میں آزادی کی جدوجہد کی نہایت اہم تقریریں، قراردادیں اور یادداشتیں محفوظ ہیں۔ آزادی کی کوئی صداقت پسند تاریخ اس کی خدمات کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔اسے فرقہ واریت کے اس رجحان سے مسلسل سابقہ رہا جسے فرنگی سامراج نے بڑی حکمت اور شاطری سے فروغ دیا لیکن یہ بیشتر حصول آزادی کے لئے سرگرداں رہی۔''

۱۸۳۰ء میں انگریزوں نے فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان بنادیا۔ظاہر ہے ایسا کرنے میں وہ مخلص نہیں تھے بلکہ اس کے پس پردہ مغلوں اور ان کی سرکاری زبان یعنی فارسی سے تعصب و دشمنی کارفرما تھی۔ڈاکٹر مسکین علی حجازی کی زبان میں فارسی زبان سے انگریزوں کا یہی تعصب اور دشمنی اردو کے فروغ کا بالواسطہ طور پر ذریعہ بنی۔

یہ تو برطانوی حکومت کی چال تھی، اب ذرا قدرت کی چال بھی دیکھئے کہ یہی اردو زبان جو اس وقت عوامی زبان تھی برطانوی حکومت کو گھر کا راستہ دکھانے میں ہندوستان کی دیگر تمام زبانوں میں ہراول دستہ کے طور پر پیش پیش رہی۔ہندوستان کی عوام میں جذبۂ

حریت پیدا کرنے میں جو کردار اردو نے ادا کیا شاید فارسی عوامی زبان نہ ہونے کی وجہ سے اس درجہ کا کوئی کردار ادا نہیں کر سکتی تھی۔

یہ کتنا تعجب خیز امر ہے کہ یہی اردو جس کو انگریزوں نے ازرہ تعصب سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا مختصر سے عرصہ میں جب وہ پل بڑھ کر جواں سال ہوگئی تو اسی نے ان کو باہر کا راستہ دکھانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

صحافی خواہ وہ کسی زبان اور کسی بھی ملک سے تعلق رکھتا ہو عوام الناس کے ساتھ براہ راست رابطے میں رہتا ہے۔ان کے دکھ درد میں شریک رہتا ہے اور خوشی و مسرت کے مواقع پر ان کی خوشیوں میں ہاتھ بٹاتا ہے بلکہ ایک طرح سے ان کو دو چند اور سہ چند کرتا ہے۔

غیر جانبداری اور عدم طرف داری صحافت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، وہ ایک طرف حکومت کا کاروبار چلانے میں تعاون کرتی ہے، رائے عامہ ہموار کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے اور دوسری طرف خود سر کار اور سرکاری کاروبار کے غلط اور بے جا رویوں سے عوام کو روشناس کراتی ہے۔

آج کے اس دور میں صحافت اور حکومت لازو ملزوم سے ہو گئے ہیں، کوئی حکومت اس وقت تک اپنا کام مکمل طور پر انجام نہیں دے سکتی جب تک وہ اپنے یہاں صحافت کو قبول نہیں کرتی اور اس کو پوری آزادی نہیں دیتی، اسی لیے صحافت کو چوتھے ستون کی اہمیت حاصل ہے۔کسی بھی ملک میں پہلی پوزیشن سیاسی لیڈروں کی ہوتی ہے دوسری مذہبی رہنماؤں کی، تیسری عوام کی اور چوتھی صحافت کی۔صحافت کو یہ باعزت مقام سب سے پہلے لارڈ میکالے نے دیا تھا جب اس نے برطانوی پارلیمان میں اخباری نمائندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہاں باہر گیلری میں اخبارات کے جو نمائندے موجود ہیں وہ اقلیم کا چوتھا طبقہ ہیں۔اہل علم وفن نے جمہوریت کے فروغ کے لیے صحافت کو لازمی قرار دیا ہے۔ایک جمہوریت ہی کیوں آج کے زمانے میں ہر طرح کے علم وفن اور ہر طرح کی آئیڈیالوجی اور نقطۂ نظر کو عام کرنے اور اس کو دور دراز کے ملکوں تک پہونچانے کے لیے صحافت سے

زیادہ کارگر کوئی دوسرا طریقۂ کار ابھی تک ایجاد نہیں ہوا ہے۔جمہوریت کو عام کرنے کی بات ہو یا مذہب کو وسعت دینے کی بات ،علم کی اشاعت مقصود ہو یا فن کی ترویج، معاشرتی و معاشی مسائل حل کرنے کی بات ہو یا صحت کے عام اصولوں کے تئیں عوام میں بیداری لانے کی بات، دنیا جہان کو بنانے کی بات ہو یا اس کو بگاڑنے کی بات، کسی ملک وقوم سے دوستی رچانا ہو یا دشمنی نکالنا ہو، صلح وآشتی کو عام کرنا ہو یا جنگ وجدال کا ماحول گرمانا ہو، کسی کو رات ورات ثریا پر پہونچانا ہو یا چشم زدن میں تحت الثریٰ میں دفن کرنا ہو۔تہذیبوں کے درمیان جنگ کرانا ہو یا ان کے درمیان صحت بخش اور امید افزا ڈائلاگ کو ترویج دینا ہو، غرض کوئی بھی کام ہو اور کوئی بھی ہاتھ، کوئی بھی مقام ہو اور کوئی بھی زمانہ، ہر حالت اور ہر گام پر، زندگی کے ہر موڑ پر اور شاہ راہِ حیات کی ہر رہ گزر پر صحافت ہی اول ہے اور صحافت ہی آخر۔پیر روم مولانا جلال الدین رومی نے کہا تھا:

از محبت مسہا زرّیں شود
از محبت نار نورے می شود
از محبت دیو حورے می شود

ان کا ماننا تھا کہ محبت ہر درد کی دوا ہے اور عدم محبت یعنی نفرت وعداوت ہر برائی کی جڑ۔محبت وہ شئی ہے کہ آگ کو نور میں تبدیل کر دیتی ہے، بدشکل دیو کو حور نما بنا دیتی ہے۔محبت سے پہلے دوست کے رخساروں پر مسّے بدنما لگتے ہیں محبت کے بعد وہی مسّے خوشنما معلوم ہونے لگتے ہیں۔ہماری معاصر دنیا میں صحافت کو جو اہمیت حاصل ہے اور زندگی کے تمام معاملات میں اس کو محرم درونِ مے خانہ ہونے کا جو اعزاز حاصل ہے، شیش محل کے بالا خانوں اور سیاسی ایوانوں سے لے کر غربت کدوں کی بوسید دیواروں تک اور کھیل کے میدانوں سے لے کر زنداں کے روشن دانوں تک اس کو جو اذن باریابی حاصل ہے، اس کی بنیاد پر ہم بلا تکلف رومی کے لفظ 'محبت' کی جگہ لفظِ 'صحافت' کو رکھ سکتے ہیں۔

صحافت کو ملک وقوم کی آئینہ دار اور صحافی کو تاریخ کا گواہ کہا گیا ہے، لیکن آج کی تاریخ میں

صحافت کا کردار صرف اتنا ہی نہیں رہ گیا ہے کہ وہ عصری تاریخ کے رازہائے سربستہ کو محفوظ رکھے اور آنے والی نسلوں تک بے کم وکاست اور کسی طرح کی کتر و بیونت کے بغیر پہونچادے، آج کی تاریخ میں صحافت کا رول اس سے بہت زیادہ ہے وہ کسی ملک یا قوم کی نہ صرف یہ کے تاریخ رقم کرتی ہے اور نہ صرف یہ کے آنے والی نسلوں کو گزشتہ قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں سناتی ہے بلکہ اس کے کردار کی سچی اور درست تصویر یہ ہے کہ وہ قوموں کی تقدیر رقم کرتی ہے، ان کو عروج وزوال سے آشنا کراتی ہے اور ان کو سرد وگرم کے مزے چکھاتی ہے۔ افراد اور اقوام کی تقدیر رقم کرنا بلاشبہ قدرت کا کام ہے تاہم آج کے دور میں قدرت کے فیصلوں میں جو چیز رنگ بھرتی ہے اور ان کو شرمندہ معنی کرنے میں بالواسطہ ذریعہ بنتی ہے وہ اس کے سوا اور کیا ہے۔

محمد اسلم ڈوگر معاشرے میں صحافت کے کردار و عمل کا جائزہ پیش کرتے ہوئے خلاصۂ کلام کے طور پر لکھتے ہیں:

> ''اس بحث سے ہم بآسانی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ معاشرے کی تشکیل میں صحافت بنیادی کردار ادا کرتی ہے اور معاشرہ انہی خطوط پر استوار ہو جاتا ہے جن پر صحافت اسے کرنے کی کوشش کرتی ہے۔'' [محمد اسلم ڈوگر، علم صحافت، صفحہ ۲۴، ناشر تاج بک ڈپو، اردو بازار، لاہور]

بیسویں صدی کی دو عالمی جنگوں اور ان کے بعد عراق و افغانستان کی حالیہ جنگو میں میڈیا نے، بطور خاص مغربی میڈیا نے جو سراسر منفی کردار ادا کیا اور کر رہا ہے اس سے کوئی بھی صاحب فراست انکار نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ یہ جنگیں اسلحہ کے زور پر لڑی گئیں اور لڑی جارہی ہیں مگر میڈیا کے ذریعہ پروپیگنڈے کے جو تانے بانے بنے گئے ہیں اور ان کے ذریعہ ایک مخصوص قوم کو نشانہ بنایا جارہا ہے اور ساری دنیا کے لئے خطرہ بنا کر پیش کیا جارہا ہے اور دنیا اس کا اثر بھی لے رہی ہے، طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ وہ پروپیگنڈے کی نفسیات اور اس کی خطرناک طاقت کو جانتے ہوئے بھی بہت ساری بے سرپیر کی باتوں پر یقین کر رہی ہے، یہ سب میڈیا ہی کی سحر آفرینی اور کرشمہ سازی ہے۔

مولانا نذرالحفیظ ندوی نے اپنی کتاب ''مغربی میڈیا اور اس کے اثرات'' میں صہیونی

پروٹوکول کے بارھویں دستاویز سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں نے صحافت کو کتنی اہمیت دی ہے اور اس سے نہ صرف دفاعی بلکہ اقدامی اور جارح طریقۂ کار کا کام لیا ہے۔ذیل میں اس اقتباس سے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چھوٹے چھوٹے دو اقتباس نقل کیے جاتے ہیں:

''ادب اور صحافت عوام کا ذہن تیار کرنے کے لیے اہم ستون ہیں،اس لیے بیشتر اخبارات اور رسالے ہم اپنی حکومت کی ملکیت میں رکھیں گے،یہ ذرائع ابلاغ نجی ملکیت کے پریس کے منفی اثرات زائل کریں گے اور رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کے لئے ہمارے ہاتھوں میں زبردست طاقت ہوں گے،اگر عوام کو ہم دس رسالوں کے اجرا کی اجازت دیں گے تو یہ اجازت اپنے تیں رسالوں کو دیں گے اور جتنے بھی رسالے چھپیں گے ان کا تناسب یہی ہوگا...''

اور آگے پڑھیے:

''ہمارے یہ سب اخبارات ہندوں کے دیوتا وشنو کی طرح ہوں گے جس کے سو ہاتھ ہوتے ہیں،ان میں سے ہر ایک انگلی حسب ضرورت رائے عامہ کے ہر شعبہ پر رکھی ہوئی ہوگی،جب نبض کی رفتار تیز ہوگی یہ ہاتھ رائے عامہ کا رخ ہمارے نصب العین کی طرف موڑ دیں گے،ہمارے مخالفین کے پاس چونکہ پریس کے ذرائع نہیں ہوں گے جن کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کا کماحقہ اور حتمی طور پر اظہار کرسکیں،ہم پریس کو ان کے خلاف استعمال کر کے فتح حاصل کرلیں گے۔دراصل رہی تردید کے ہمیں ان کی تردید کرنے کی ضرورت پیش بھی نہیں آئے گی۔''[نذرالحفیظ ندوی،مغربی میڈیا اور اس کے اثرات،صفحہ ۱۴۸/۷، ناشر،ندوۃ العلماء لکھنؤ،طبع سوم ۲۰۰۲ء]

صحافت اور ادب میں تال میل کو لے کر خاصی بحث ہوئی ہے اور لکھنے والے اب بھی لکھ رہے ہیں لیکن زیادہ صحیح اور درست بات یہ ہے کہ صحافت اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے،دونوں ایک دوسرے کے معاون ومددگار ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ادب صحافت کا مددگار رہو یا نہ ہوتا ہم صحافت ادب کی نشر واشاعت اور توسیع کا خاصہ

اہتمام کرتی ہے۔اخبارات میں لکھنے والے بہت سارے حضرات ادیب ہوتے ہیں، ایک طرف ان کی تحریریں اخبارات کی زینت ہوتی ہیں اور دوسری طرف خود ان کے انٹرویوز اور افکار وخیالات نیز ان کے شخصی حالات اور ان کے علمی و ادبی کارنامے بھی اخبارات میں شائع ہوتے ہیں اور اس طرح ادیب بھی معاشرے سے جڑے رہتے ہیں اور ان کے نظریات ادب کے مخصوص ومحدود پلیٹ فارم کے برخلاف صحافت عمومی دائرۂ اشاعت کے توسط سے عام لوگوں تک پہونچتے ہیں۔

صحافت اور ادب کے اس خاص موضوع پر رشید حسن خان کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''اس ساری بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اصل چیز لکھنے والے کا طریقِ عمل ہے، اس انداز فکر اور انداز نظر سے بہت اچھے صحافی کی تحریر ادبی ہو سکتی ہے اور بہت اچھے ادیب کی تحریر صحافیانہ ہو سکتی ہے۔ادب اور صحافت میں دوری کی نسبت ہے، مگر یہ دونوں نسبتیں ایک ہی شخص میں بخوبی جمع ہو سکتی ہیں اور اس کی تحریروں میں نمایاں ہو سکتی ہیں۔صحافت کا جو مزاج اور انداز ہے اس سے ہم سب واقف ہیں، جب ادیب بھی اسی طرز اور اسی انداز کو اپنائے گا تو وہ صحافیانہ ادب کی تشکیل کی ذمہ داری کو اپنے اوپر مسلط کرے گا۔'' [ادب اور صحافت۔رشید حسن خاں، اردو صحافت، مرتبہ انور علی دہلوی، اردو اکادمی دہلی] ◆◆